سوال نمبر 2 (الف)۔۱

سخت سردیوں کی ایک رات کو باپ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ باہر ہوا سرد اور تند تھی۔ چونکہ وہ گرم لحاف سے نکلا تھا اس لیے ہوا اس کے سینے پر جا کر لگی اور اسے نمونیا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو گیا۔

سوال نمبر 2 (الف)۔۲

بیماری کے دوران باپ سے گھر والوں کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اس کے بیٹوں نے اس کا بہت علاج کروایا اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی تیمارداری کرتیں مگر اسے کچھ افاقہ نہ ہو سکا

سوال نمبر 2 (الف)۔۳

باپ کی موت کے بعد ایک روز اس کا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا کہ پرانے اسباب میں سے ایک بوری میں اسے کتبہ مل گیا۔

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 2 (الف)۔۴

چونکہ بیٹے کو باپ سے بہت محبت تھی اس لیے کتبے پر اپنے باپ کا نام دیکھتے ہی وہ بے اختیار رو پڑا اور محبت کے عالم میں اس پر کندہ الفاظ اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔

سوال نمبر 2 (الف)۔۵

جب بیٹے کو کتبے کو استعمال میں لانے کے لیے ایک خیال سوجھا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے کتبہ سنگ تراش کو دیا اور اس کی عبارت میں کچھ ترمیم کروانے کے بعد اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

سوال نمبر 2 (الف)۔۶

سوال نمبر2(الف)۔۷

سوال نمبر2(ب)۔۱

اہل وطن اپنے سپاہیوں اور مجاہدین پر فخر کرتے ہیں۔ ان کے بلند حوصلے، جوش و جذبے اور تیز تلوار پر نازاں ہیں جو دشمن سے ان کی حفاظت کرتی ہے اور وطن کی حرمت برقرار رکھتی ہے۔

سوال نمبر2(ب)۔۲

وطن کے عروج و زوال کا انحصار اس کے نوجوانوں اور سپاہیوں پر ہے۔ اگر وہ جوش و ولولے کے ساتھ دشمن سے لڑتے رہے تو وطن زندہ اور خوشحال رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ان کے حوصلے پست ہو گئے تو وطنِ عزیز کو بھی تباہی سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔

سوال نمبر 2(ب)۔۳

وطن سے بے لوث محبت اور اس کے تحفظ کا جذبہ ہی مسلح افواج کو حرکت و عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ جب وطن کی بات ہو تو وہ کسی بھی صورت پیچھے نہیں رہتے بلکہ دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سوال نمبر 2(ب)۔۴

سوال نمبر 2(ج)۔۱

شاعر کے نزدیک آداب عشق کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق معشوق کی راہ میں آنے والی آزمائشوں پر گلہ شکوہ نہ کرے بلکہ خاموشی سے اسے برداشت کرتا رہے۔ محبت کی راہ کا پہلا اصول یہی ادب ہے۔

سوال نمبر 2(ج)۔۲

سوال نمبر 2(ج)۔۳

شاعر کسی بات پر حیرت کا اظہار اس لیے نہیں کرتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کے اطراف میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اسی طرح سے وقوع پذیر ہونا ہے۔ اس کے اردگرد حالات و عوامل ہی کچھ اس طرح تھے کہ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔

سوال نمبر 2(د)۔۱

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 2(د)۔۲

الف ۔ دو (دینا)

ب ۔ اٹھا (اٹھنا)

ج ۔ لیا (لینا)

سوال نمبر 2(د)۔۳

قافیہ

رسائی ، جدائی ، خدائی

ردیف

کا

متعلقہ سوال کا جواب صرف مختص کردہ جگہ پر اور بیرونی نشان کے اندر دیا جائے۔

09

22524593

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 1/4)

(الف)

تشریح

تشریح طلب اقتباس میں مصنف سعادت حسن منٹو نے منظور اور اختر کی بے مثال دوستی کا ذکر کیا ہے۔ منظور ایک نو دس برس کا لڑکا تھا جو فالج کے مرض کے باعث ہسپتال میں داخل تھا جبکہ اختر بتیس سال کا آدمی تھا جو کورونری تھرمبوسس جیسی بیماری میں مبتلا تھا۔ مصنف کہتے ہیں کہ چونکہ دونوں کے بستر ساتھ ساتھ تھے اس لیے آہستہ آہستہ دوستی بڑھتی گئی۔ ویسے بھی منظور بہت خوش گل اور شائستہ تھا۔ وہ بہت آسانی سے ہر کسی کو دوست بنا لیا کرتا۔ اس کی معصومیت اور خوبصورت باتیں اختر کے غمزدہ دل کو بھی بھانے لگیں اور بہت جلد ان کی دوستی اور رفاقت بہت بڑھ گئی۔ اختر کی بیماری نے اسے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ زندگی کے نامساعد حالات اور پھر اس بیماری کی تکلیف اسے بہت بے چین رکھتی۔ گویا:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 2/4)

چکا تھا۔ اس کے اندر جینے کی امید ختم ہو چکی تھی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس نے مر جانا ہے۔ وہ اس بیماری سے صحت یاب نہیں ہو چکا۔ لیکن جب منظور کی صحبت میں اس نے وقت گزارنے کا موقع ملا تو منظور کی باتوں نے اس کے نظریات کو تبدیل کر دیا اسے زندگی کی اہمیت سے آگاہ کیا اور کسی بھی موقع پر مایوسی سے گریز کرنے کا سبق دیا۔ اختر نے سیکھا کہ

"مایوسی کفر ہے۔"

منظور نے اپنی باتوں کے ذریعے اس کے اندر جینے کی امید پیدا کر دی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اب اسے افاقہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منظور کو وہ ایک مسیحا سمجھتا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے نے اس کو ایک نئی زندگی عطا کی وہ تو اسی مایوسی میں مرنے کے لیے تیار تھا لیکن منظور نے اسے زندگی کا نیا رخ دکھایا۔ اختر کے سر پر جو کالے بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ گئے۔ اب اس کی سوچ میں تبدیلی آئی اور اسے احساس ہوا کہ مشکلات سے نکلنے کے لیے ہمت و حوصلہ درکار ہوتا ہے اگر انسان مایوس ہو کر بیٹھ جائے تو مشکلات اسے مزید بڑی لگنے لگتی ہے۔ اگر انسان اپنے

متعلقہ سوال کا جواب صرف مختص کردہ جگہ پر اور بیرونی نشان کے اندر دیا جائے۔

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 3/4)

سیکھا کہ

ے وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا

منظور کی بدولت اختر کی مایوسی امید میں بدل چکی تھی۔ اب وہ بذات خود چاہتا کہ وہ مکمل صحت یاب ہو کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ یہ سب صرف اور صرف منظور ہی کی بدولت ہو سکا تھا۔ منظور نے اسے زندگی سے محبت کرنا سکھائی۔ موت تو برحق ہے لیکن زندگی کو تکلیفوں کے سہارے نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ ان تکلیفوں کا بھرپور مداوا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اللہ سے اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔

المختصر اس اقتباس میں مصنف نے اختر کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح منظور کی بدولت وہ زندگی کا مثبت رخ دیکھنے کے قابل ہوا اور اس کے مایوس دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر3 (صفحہ نمبر 4/4)

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1/4)

(ب)

تشریح

زیر نظر تشریح طلب بند جوش ملیح آبادی کی ہر دل عزیز نظم "مناظرِ سحر" سے لیا گیا۔ اس بند میں شاعر نے صبح کے وقت کی خوبصورتی اور دلکشی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ صبح کے دلفریب ماحول کو نہایت خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ کہتے ہیں صبح کا ہر منظر ایسی گویا دل میں گھر کر جاتا ہے۔ روح کو لطافت اور تازگی بخشتا ہے۔ ہر طرف گویا نیا پن اور ایک عجب تازگی محسوس ہوتی ہے۔ صبح کے وقت جب کلیاں چٹک کر پھول بنتی ہیں تو ان کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے جو فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ اس وقت یہ خوشبو کسی بھی چیز سے زیادہ مسحور کن لگتی ہے۔ زیر نظر شعر میں شاعر نے پھولوں کی خوبصورتی پر کیا خوب کہا ہے:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

رہی ہوتی ہے اور سورج اس کی جگہ لے رہا ہوتا ہے۔ روشنی اور تاریکی کا یہ حسین امتزاج گویا دل موہ لیتا ہے۔ مدھم سی چاندنی میں سمندر جھلکتا ہے۔ سمندر پر جب اس روشنی کی جھلک نظر آتی ہے تو انتہائی دلفریب منظر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس ہلکے ہلکے اندھیرے میں پودوں پر پڑے اوس اور شبنم کے قطرے بھی چمکنے لگتے ہیں اور ایسا لگتا ہے گویا موتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ روشنی اور مہک گویا ہر طرف پھیلتی ہی چلی جا رہی ہے۔ حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا:

ے یکایک ایک تازگی
یکایک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں سما گئی
حیات جیسے مسکرا گئی

شاعر کہتا ہے کہ صبح کے اس خوبصورت منظر میں سبزہ اور کھیت بھی اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سبزہ جھوم رہا ہے اور کھیت صبح کی ہلکی ہلکی ہوا میں لہلہا رہے ہیں صبح کے وقت جو بادِ صبا چلتی ہے اس میں ایک الگ ہی نغمگی ہے جس کی وجہ سے کھیت کھلیان بھی

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 3/4)

ہواؤں کے رباب اٹھے
خوش آمدید کے لیے

صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو درختوں کی شاخوں پر بھی اثر ہوتا ہے۔ اگر ان شاخوں کو دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاخیں ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں جیسے خوشی کے موقع پر ہم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں یعنی صبح کے وقت میں ایسی دلکشی ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے اس خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ اسی خوبصورت منظر کے بارے میں حفیظ جالندھری نے کہا:

یہ فرش سبز گھاس کا
یہ صحت آفریں سماں

کہتے ہیں کہ یہ منظر اس قدر دل فریب ہوتا ہے کہ ہر آنکھ اس پر فدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر کوئی اس انداز سے خوش و خرم دکھائی دیتا ہے گویا آج عید کا دن ہے۔ شاخیں، کھیت، پودے، پھول گویا آج عید منا رہے ہیں۔ صبح کی ہوا بھی جب چلتی ہے تو وہ بھی پیغام لے کر آتی ہے کہ

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 4/4)

جھوم رہا ہوتا ہے۔ صبح کے وقت کے حسن و لطافت
کے بارے میں شاعر نے کہا:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 1/6)

(الف)

شعر 1

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

تشریح

یہ شعر احمد ندیم قاسمی کی غزل کا خوبصورت شعر ہے۔ اس شعر میں شاعر ایک آفاقی حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو موت ہے۔ قرآن پاک میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا:

کل نفس ذائقۃ الموت

"ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے"

یہ دنیا فانی ہے۔ عارضی قیام گاہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہماری زندگی کچھ وقت کی ہے اور پھر موت آجائے گی۔ زندگی کی اسی بے ثباتی کو شاعر نے بیان کیا:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2/6)

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کا نظریہ غلط ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ موت گویا زندگی کا اختتام ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھول رہے ہوتے ہیں موت کے بعد ایک نہ ختم ہونے والی زندگی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ موت تو بس ایک حادثہ ہے، ایک دروازہ ہے جو اس عارضی قیام گاہ سے ہمیں ابدی رہائش تک منتقل کر دیتا ہے۔ زندگی کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا:

ے زندگی ایک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی جس کا سلسلہ ختم ہوتا نہیں

شاعر کہتا ہے کہ موت آنے سے انسان مرتا نہیں بلکہ دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے۔ دنیا کے لوگوں کے لحاظ سے وہ مر چکا ہوتا ہے لیکن اس کی صرف جسمانی موت واقع ہوتی ہے۔ اس کی روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ شاعر خود کو دریا سے تشبیہ دیتے ہوئے موت کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح دریا جب سمندر میں بہہ جاتا ہے تو گویا اس کا ظاہری وجود ختم ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک وسیع تر حلقے میں داخل ہو جاتا ہے اور امر ہو جاتا

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 3/6)

جاتا ہے۔ یہی ہماری زندگی کا فلسفہ ہے۔ بلاشبہ ہم سب کو یہی اخروی ... آرام گاہ تک پہنچنا ہے۔ بقول شاعر:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
اگر تو میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

شعر ۲

تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

تشریح

یہ شعر حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں مراد لیا جا سکتا ہے۔ اگر مجازی اعتبار سے دیکھیں تو شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر اس سے اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اے محبوب! تمھارے در کے علاوہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میرے جینے کا واحد مقصد صرف اور صرف تم ہو۔ اگر میں نے تمھارا در چھوڑ دیا تو میں اور کہاں جا سکتا ہوں۔ تمھاری محبت کی خاطر تو میں نے ہر خوشی سے دل اٹھا لیا۔ میرے جذبات کا محور صرف تم ہو۔ تمھاری خاطر میں نے ہر خوشی، ہر چیز کو پس پشت ڈال

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 4/6)

ے وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لیے
ہر ایک چیز سے دل اٹھا کر چلے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! اگر میں نے تیرا در چھوڑ دیا یا تیری محبت کو بھلا دیا تو میری زندگی کا مقصد ختم ہو جائے گا۔ پھر یا تو میں خود کو گھر میں قید کر لوں گا اور تنہائی سے مر جاؤں گا یا پھر مجنوں کی طرح دیوانہ وار صحرا میں پھرتا رہوں گا اور ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاؤں گا۔ شاعر نے نہایت خوبصورتی سے محبت کا اظہار کیا ہے:

ے جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا کہ دعا کیا ہے

اگر حقیقی معنوں میں دیکھا جائے تو شاعر اپنے رب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے میرے رب! میں تیرا ایک گنہگار اور عاجز بندہ ہوں۔ یہ تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ میری خطائیں معاف کر دے۔ شاعر انتہائی عاجزانہ انداز میں اللہ سے کہتا ہے کہ اگر میں نے تیری ذات سے دوری اختیار کی تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ تو ہی ہم سب کا مالک ہے۔ بھلا تیرے اختیار سے ہم دور کیسے جا

کی طرح ختم ہو جائیں گے بقول شاعر:

پورے قد سے جو میں کھڑا ہوں تو یہ ہے تیرا کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا سہارا تیرا

شعر ۳

تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف ایک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

تشریح

شاعر انتہائی عاجزانہ انداز میں اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کرتا ہے کہ اے محبوب! میری محبت اور میری سوچ کا محور و مرکز تم ہی تو ہو۔ میں اگر کبھی اس محبت سے دستبرداری کا سوچتا بھی ہوں تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اگر میں تمھارے در کے چکر کاٹنا چھوڑ دوں یا تجھ سے محبت کا اظہار نہ کروں تب بھی یہ محبت میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔ مجھے جو مرضِ عشق لاحق ہوا اس کی کوئی دوا نہیں۔ بقول شاعر:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 6/6)

یوں مجھے اس میں اپنے محبوب کا عکس دکھائی دیتا ہے محبوب میرے دل و دماغ سے کبھی نکل ہی نہیں پاتا۔ میرا محبوب جفا کوش ہے بے رخی اور بے اعتنائی برتنے والا ہے۔ میرے پر خلوص جذبات کی قدر نہیں کرتا اس کے باوجود میں اس کی یادیں اپنے دل سے نہیں نکال سکتا کیونکہ وہی میرے اس دل کے دھڑکنے کا واحد سبب ہے۔ بقول شاعر:

ے دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

گویا شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی یادیں میرے دل میں پیوست ہیں جسے میں خود بھی نکالنے سے قاصر ہوں۔ یہی وجہ ہے دنیا کا ہر نظارہ مجھے اپنے محبوب کی یاد دلاتا ہے۔ ہر چیز میں اسی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ محبوب کی شکل و صورت کے علاوہ کوئی اور منظر میری آنکھوں کے سامنے ہی نہیں آ پاتا۔

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1/3)

ایک درخت کی آپ بیتی

میں ایک شکستہ حال درخت ہوں۔ جس روپ میں آپ مجھے اس وقت دیکھ رہے ہیں یہ ازل سے میرا یہ روپ نہیں تھا۔ کبھی میں بھی عروج کے زینوں پر رواں دواں تھا۔ میں اس خراب حالت میں کس طرح پہنچا اور زندگی مجھ پر کس طرح بیتی آج میں آپ کو اپنی کہانی اپنی زبانی سناتا ہوں۔

ع اک ذرا سنیے میری آوارگی کی داستاں
میں کہاں تھا کس لیے اور کس طرح پہنچا یہاں

کچھ عرصے پہلے کی بات ہے میں شہر کی مرکزی سڑک کے کنارے موجود ایک درخت تھا۔ میں آم کا درخت تھا اور یہی میری سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ میرے بڑے بڑے پتے، مضبوط لکڑی مجھے دوسروں کے درمیان ممتاز بنا دیتی۔ میرے گرد و نواح میں اور بھی بہت سے درخت تھے لیکن عمر اور مضبوطی کے لحاظ سے میرا کوئی ثانی نہیں تھا۔ شہر کے مالی جو میرا اور دوسرے درختوں کا خیال رکھنے پر مامور تھے، ہماری بہت نہایت دھیان سے دیکھ بھال کرتے یہی وجہ ہے کہ زندگی بہت سکون سے

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 2/3)

نمائندہ پھل اتار کر مختلف منڈیوں میں فروخت کر دیتے
میں بہت خوش تھا کہ میرے لذیذ اور شیریں پھل کسی
کی غذا بنیں گے۔ میرا مقصد یہی تھا کہ

ع ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

میں اپنے اس استعمال اور نگہداشت پر بہت مطمئن
تھا۔ حکومت کا نظام بہت اچھا جس کی وجہ سے ہمیں ضائع
کرنے پھل باغ توڑنے کی اجازت نہیں تھی
وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے اور انسان کو
معلوم بھی نہیں ہو پاتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے
خوشیاں اور غم تو زندگی کا حصہ ہیں۔ گویا

ع کبھی دل ہے خوش کبھی درد مند
زمانے کی ہے جیسے پستی و بلند

یوں لگتا کہ آزمائشیں میری زندگی کے دروازے پر بھی
دستک دے رہی ہیں۔ ہوا یوں کہ سڑک کے اردگرد
جتنی زمین تھی وہ سب ایک اثر شخص نے ہاؤسنگ
سوسائٹی بنانے کے لئے خرید لی۔ اب حکومت کے بجائے
اس کا حکم چلتا۔ وہ ہم درختوں کی کوئی قدر نہ کرتا بلکہ

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 3/3)

کوئی انھیں پوچھنے والا نہ ہوتا۔ پھر ایک دن آیا جب مجھے اپنے آردگرد ٹریکٹروں کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک ٹریکٹر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں حواس باختہ ہو گیا۔ زور زور سے چیخنے لگا لیکن افسوس کوئی مجھے نہ بچا سکا۔ اسے ٹریکٹر کے خطرناک بلیڈ میرے بدن کو لگے تو میں کانپ اٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مجھے پورا ہی کاٹ ڈالا۔ میں اپنے پورے وزن کے ساتھ زمین پر آگرا۔ تکلیف کی شدت سے میں کانپ رہا تھا۔ موت گویا میرے سر پر منڈلا رہی تھی۔

اب میں اسی سڑک پر پڑا انتظار کر رہا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی کب موت کے پنجے مجھے اس اذیت سے چھٹکارا دلاتے ہیں۔

ے موت سے کس کو رستگاری ہے
آج تم کل ہماری باری ہے

ے گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھی کی یاد میری زندگانی ہے

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 1/7)

(ج)

میرا پسندیدہ شاعر

عظیم انسان روز بروز پیدا نہیں ہوتے ایسے لوگوں کے لیے صدیوں تاریخ کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہزار ہا شب و روز کی کروٹوں اور انسانیت کی بے شمار دعاؤں کے بعد ایک ایسا انسان پیدا ہوتا ہے جو خود عظمت کے معیار قائم کرتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بھی انھی عظیم انسانوں میں سے ایک تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ہوگا۔ آپ کی شاعری زبان زد عام ہے اور اسی لیے میرے پسندیدہ شاعر بھی علامہ اقبال ہیں۔

ے اک ابر تو بہار فضاؤں پہ چھا گیا
اقبال اس چمن کی رگوں میں سما گیا

حکیم الامت، عظیم المرتبت، شاعر مشرق، مفکر پاکستان ڈاکٹر محمد علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قدیم طرز کے دینی مکتب میں حاصل کی۔ مشن ہائی سکول

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2/7)

مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے کیا پنجاب یونیورسٹی میں آپ کو پروفیسر آرنلڈ جیسے محقق اور شفیق استاد ملے جنھوں نے آپ کے ذہن کو فلسفیانہ جلا بخشی۔

۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ چلے گئے وہاں انگلستان سے بیرسٹری اور جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آکر وکالت کو بطور پیشہ اپنایا مگر آپ کا اصل میدان شاعری تھا جہاں آپ نے ایک نیا دور قائم کیا۔ آپ کے نزدیک

ے جہانِ تازہ کی ہے افکارِ تازہ سے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

۱۹۲۶ء میں سیاست میں قدم رکھا تو مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بنے جس کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں آپ نے تاریخی خطاب کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ ملی روایات کی بنا پر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ اسی تصور کی بنا پر آپ کو تصورِ پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔

برصغیر میں سیاسی اور سماجی حیثیت کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال بطور شاعر زیادہ فعال اور متحرک نظر آتے ہیں

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 3/7)

کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور ابتدا سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کا زمانہ ہے۔ اس دور میں کوئی نظریہ شاعری نہیں کی بلکہ وطنی شاعری سے آغاز کیا۔ ہمالہ، ایک آرزو اور ترانۂ ہندی جیسی نظمیں لکھیں۔ ترانۂ ہندی میں خاص طور سے یہ راگ الاپا۔

ے ہندی ہیں ہم ہندوستان ہمارا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کا دور ہے۔ جب اقبال یورپ میں تھے۔ وہاں کی تہذیب و تمدن کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہ سمجھ گئے کہ نئی تہذیب کی اندھی تقلید تباہ کن ہے جبکہ اسلامی روایات کا دامن تھام لینے میں ہی ہماری نجات ہے۔ اس دور میں آپ کے نظریۂ قومیت میں تبدیلی آئی اور وہ سورج جو صرف ہندوستان تک محدود تھی اب سارے جہاں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔

ے چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 4/7)

شاعری پیغمبری بن جاتی ہے۔ خیالات بلند اور سوچ پختہ ہو جاتی ہے۔ کلام میں درد، سوز، ترنم واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس دور میں اقبال اپنی شاعری میں مختلف علامات متعارف کرواتے ہیں اور ان کی روشنی میں اپنی قوم کی بہترین تربیت کرتے نظر آتے ہیں۔

خودی کا تصور اقبال کی شاعری کی بنیاد ہے۔ یہ خود شناسی سے خدا شناسی تک کا عمل ہے جو انسان کے لیے رب کی رضا کو سمجھنے میں معاون ہے۔ اسی لیے کہا:

ع خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کے نزدیک خودی کی پہچان کرنے والا مردِ مومن ہے جس کا اخلاق، کردار اور اعمال پاکیزگی کے مظہر ہوں

ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

مردِ مومن اقبال کی شاعری کا محور ہے۔ اقبال کے نزدیک مردِ مومن قوموں کی تعمیر کرتا ہے۔ ایک مسلمان اپنے اندر مردِ مومن کی صفات پیدا کیے بغیر نامکمل اور خام ہے۔

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 5/7)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
غفاری و قہاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

عشقِ رسول ﷺ کے بغیر اقبال کا فلسفہ حیات بے معنی ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کے بغیر دنیاوی اور اخروی زندگی دونوں اکارت ہیں۔

ع کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبال عقل کی افادیت کے قائل ہیں لیکن وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں ان کے نزدیک عقل صرف منطق کی پہچان کراتی ہے جبکہ عشق منطق کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔

ع بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف ہیں۔ اس لیے کہا۔

ع جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایک فرد کو چاہیے کہ اتحاد اور اتفاق کے ساتھ ملت کے ساتھ جڑ جائے۔ یعنی اپنی خودی کو مضبوط کرے اور اپنی صلاحیتوں کو جماعت کے لیے وقف کر دے۔ یہی رمزِ بےخودی ہے۔

؎ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال نوجوانوں کے لیے شاہین کا استعارہ استعمال کرتے ہیں جو بلند پرواز رکھتا ہے اور مردار نہیں کھاتا۔ اقبال نوجوانوں میں انقلابی روح بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو جان گئے اس لیے اس کے سخت خلاف ہیں۔ مغرب کو کہتے ہیں کہ تمھاری تہذیب زیادہ عرصے باقی رہنے والی نہیں ساتھ ہی مسلمانوں کو مغرب کی تقلید سے گریز کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

؎ دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اقبال کا کلام سادہ اور علم و حکمت سے بھرپور ہے۔ آپ

The relevant question should be answered only in the allotted space and inside the outer mark

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 7/7)

میں جاوید ناصر، رموزِ بیخودی، اسرارِ خودی جیسی تصانیف
ہیں۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء قوم کے اس عظیم خیر خواہ نے دارِ فانی
سے کوچ کیا۔ لیکن اقبال اپنی شاعری کی صورت
ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہر دور کو یہ اقبال کا دور ہے۔

ع چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

© 2023 - ImageViewer - Privacy